عہد حاضر میں اردو غزل

اردو غزل اپنی ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے آج اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہے۔اس درمیان اس نے کئی نشیب وفراز دیکھے۔کبھی موردالزام بھی ٹھہری اوراسے قابل گردن زدنی سمجھا گیالیکن اس کے باوجود ہر عہد میں غزل کا چراغ روشن رہا۔اور ہر عہد میں نئے رجحان کے تحت غزل پر طبع آزمائی کی گئی۔ ہیئت میں تبدیلی بھی ہوئی۔خصوصاً جدید دور کے شعرا نے غزل کی ہیئت و اسلوب میں بڑے پیمانے پر تبدیلی کی۔ یہ رجحان ترقی پسند تحریک کے بعد پیدا ہوالیکن اس کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے لگیں کیوں کہ اس میں گہری اور ذاتی علامتوں کا استعمال اس قدر ہونے لگا کہ غزل چیستاں بننے لگی۔اس کے خلاف ردعمل ہوااور پھر ایک نئے رجحان نے جنم لیا جس کا نام مابعد جدیدیت رکھا گیا۔ یہ رجحان بہت آگے نہیں بڑھ سکا اور بعد کے شعرا نے تمام تر رجحانات سے آزاد ہو کر آزادانہ طور پر غزل گوئی کی طرف توجہ دی۔ ۱۹۸۰ کے بعد سے تا ہنوز جو غزل دیکھنے اور پڑھنے کو مل رہی ہے اس میں کسی رجحان کی کارفرمائی نہیں لیکن عہد حاضر کے تمام شعرا اپنے عصر کے مسائل اور حالات کی عکاسی اپنی غزلوں میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔آج کی غزل کا انداز بیانیہ ہے۔سیدھے سادے لفظوں میں اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی واضح انداز کرنے کا ہنر عام ہو رہا ہے۔

عہد حاضر کے غزل گو شعرا کے یہاں نہ ہیئت میں تبدیلی نظر آتی ہے اور نہ ہی وہ باتوں کو الجھا کر پیش کرنے کے قائل ہیں۔اس طرح اردو غزل نثر سے قریب ہو گئی ہے۔

موضوع کی سطح پر عہد حاضر کے غزل گو شعرا ناانصافی ،ظلم و استبداد، حق تلفی اور بدعنوانی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں خوف اور تشکیک نہیں ہے۔حالانکہ یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ آج کی غزل میں اثر آفرینی کی کمی کا احساس ہوتا ہے تاہم اظہار کی سطح پر شعرا کسی مصلحت اندیشی کے شکار نہیں ہیں۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ صورت حال اور انداز ماقبل شعرا کا بھی رہا ہے لیکن یہ بات بلاتردد کہی جاسکتی ہے کہ پیش رو شعرا نے اپنا احتجاج علامتوں کے سہارے درج کرایا ہے جب کہ عہد حاضر کے شعرا علامتوں سے گریز کرتے ہوئے غزل کے فن کی آبیاری کر رہے ہیں۔

عہد حاضر کے غزل گو شعرا کی اس صف میں وہ شعرا بھی شامل ہیں جو اس سے قبل جدید اور مابعد جدید رجحان کے تحت غزلیں کہہ رہے تھے۔اور نئی نسل کے شعرا بھی شامل ہیں۔ظہیر صدیقی ،علیم اللہ حالی ،سلطان اختر ،افتخار امام صدیقی ،مظفر حنفی ،اسلم آزاد، راحت اندوری ،مہدی پرتاپ گڑھی ،عمران پرتاپ گڑھی ،شہپر رسول ،خورشید اکبر ،ظفر انصاری ،تابش مہدی ،حنیف ترین ،شہناز نبی ،فرحت احساس ،احمد محفوظ ،عاصم شہنواز شبلی ،ظہیر رحمتی ،نعیم انیس ، مینو بخشی ، ظفر انصاری ظفر ،راشد انور راشد ،خالد عبادی ،عین تابش ،عالم خورشید ،عطا عابدی اور نوشاد مومن کے علاوہ بہت سے نئے شعرا زلف غزل کی مشاطگی میں مصروف ہیں۔

فنکار اپنے عہد اور ماحول سے وابستہ ہوتا ہے۔اس سے اثرات قبول کرتا ہے اور پھر فنی جامہ پہنا کر اسے سماج کو لوٹا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ادب اپنے عہد کی سیاسی ،سماجی ،معاشرتی ،معاشی ،تہذیبی اور اقتصادی صورت حال کی تاریخ ہوتا ہے۔اور اس سے اس عہد کے حالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہوئے عہد حاضر کی غزل جدید دور کی سائنسی اور مشینی ایجادات ،اس کے منفی اور مثبت اثرات ،صنعتی دور میں انسان کی کم مائیگی اور ایک ایسی تہذیب جس پر مشین حاوی ہے کہ ترجمانی بھی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔جدیدیت کے علمبردار شمس الرحمان فاروقی نے جدیدیت کی وکالت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

’’میں اس شاعری کو’’جدید‘‘سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف، تنہائی، کیفیت انتشار اوراس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہو جو جدید صنعتی اور مشینی میکانکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوش حالی، ذہنی کھوکھلے پن، روحانی دیوالیہ پن اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے۔‘‘

یہاں غرض جدیدیت کی وکالت نہیں ہے بلکہ اس بات کی طرف وجہ مبذول کرانا ہے کہ ادب اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے جس کی جانب مذکورہ بالا اقتباس میں شمس الرحمان فاروقی نے اشارے کئے ہیں۔ جدیدیت کے دور میں احساس جرم، خوف، تنہائی، انتشار، بے چینی، محرومی، صنعتی اور مشینی میکانکی تہذیب ایک بڑی حقیقت بن کر سامنے آئی تھی جس کی ترجمانی کرنے کے لئے محولہ بالا جدیدیت کے ناقد نے شعرا کو متوجہ کیا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر دور معاملات و مسائل سے دوچار رہا ہے لیکن ان کی نوعیت مختلف ادوار میں الگ الگ رہی ہے۔ جس قدر زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اسی قدر نئے مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ عہد حاضر میں مسائل کا سیلاب امنڈ آیا ہے۔ آج کا انسان مسائل میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ بقول رشید امجد

’’آج کے مسائل ہر گھر، ہر صحن، ہر محبوبہ، اور ہر محبوب کے گرد بھوتوں اور چڑیلوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ محبوب کی مجلس ہو یا عاشق کا گھر ہر جگہ زمانے کی ضرورتیں انسان کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ چمنیوں کا کثیف دھواں شفق کی سرخی کو نگل گیا ہے۔ مل کا ہوٹر محبوب کی مترنم آواز اور گنگناہٹیں کھا گیا ہے اور جذبے موٹی موٹی چاردیواریوں کے نیچے دبے ہوئے سسک رہے ہیں۔ انسانی ضرورتوں کی دلدلوں میں گردن گردن ڈوب چکے ہیں۔‘‘

یہ صورت حال ۱۹۸۰ سے قبل بھی تھی آج کی بھی یہی حقیقت ہے۔ آج کا انسان ان سے نبرد آزما ہے۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے کھانا، پانی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کے بغیر اس کی زندگی کا سفر ممکن نہیں۔ عہد حاضر میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری نے لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ خصوصاً ادنیٰ اور متوسط طبقے کی زندگی اس سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ عسرت و تنگی ان طبقوں کے افراد کا مقدر بن گئی ہے۔ وہ اس تنگی کو دور کرنے کے لیے روزی روٹی کی تلاش میں شہر بہ شہر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ مگر پھر بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جنھیں اتنی تگ و دو کے بعد بھی بھر پیٹ کھانا نصیب نہیں ہو پا رہا ہے۔ ایسے میں وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اپنے ضمیر تک کا سودا کرنے کو تیار ہیں۔ اس تعلق سے چند اشعار قابل توجہ ہیں :

شکم کی آگ سے بڑھ کر کوئی وبال ہے کیا
ہمیں خبر ہی نہیں ہجر کیا، وصال کیا
عالم خورشید

یہ زندگی کا تقاضا ہے کچھ نہ اب سوچوں
ضمیر بیچ کے روٹی خریدنے نکلوں
ظفر انصاری ظفر

وقت کیوں تھم گیا پتہ تو کرو
رات بے نور ہے شرر تو ملے
توقیر عالم توقیر

سائنسی ایجادات سے بہت سی نئی نئی چیزیں وجود میں آئی ہیں جن سے انسانی زندگی کی سہولتوں میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس کی وجہ سے لوگوں میں سہل پسندی کی وبا بھی پھیلی ہے جس کے نتیجے میں مختلف طرح کے ذہنی اور جسمانی امراض وجود میں آ گئے ہیں۔ اس سے انسان کا سکون و قرار بھی چھنتا جا رہا ہے، ذہنی انتشار، بے چینی، گھبراہٹ میں مبتلا ہونے کے باعث اس پر دہشت اور خوف کا عالم طاری ہو گیا ہے۔ انسان پر اضمحلال طاری ہے۔ اور وہ ایک مشین کی طرح مسلسل چل رہا ہے۔ احساسات جیسے مردہ ہوتے جا رہے ہیں۔ شاعر اس صورتحال کو محسوس کرتا ہے اور اس کی آئینہ سامانی اس طرح کرتا ہے:

زندگی شرط ہے جینے کی جی رہا ہوں میں
کیسے کہہ دوں کہ شکم پروری نہیں ہوتی
بے سبب صبح بھی آتی ہے شام ڈھلتی ہے
رات میں دن میں کوئی برتری نہیں ہوتی

توقیر عالم توقیر

پڑی ہے وقت کی زنجیر میرے پاؤں میں
محال ہے مرے وعدے کا اب وفا ہونا

ظفر انصاری ظفر

عہد حاضر کی برق رفتاری نے انسان کو اس قدر مصروف کر دیا ہے کہ اس کا رشتہ فرد اور سماج سے کٹتا جا رہا ہے جس کے سبب سماج میں دوریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ موبائل اور انٹرنیٹ کے استعمال نے انسان کو خود میں اتنا مصروف اور اس مصروفیت نے اتنا بے حس بنا دیا ہے کہ خون کے رشتوں میں بھی دوری پیدا ہو رہی ہے۔ خلوص و محبت، اخوت و ہمدردی، باہمی میل جول، غمخواری و غم گساری اور جذبہ انسانیت کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ مشترکہ خاندان ٹوٹ رہا ہے، سنگل فیملی کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے سماج میں ابتری اور بیگانگی پیدا ہو رہی ہے۔

پھیلا ہوا تھا شہر میں تنہائیوں کا جال
ہر شخص اپنے اپنے تعاقب میں غرق تھا

سلطان اختر

اس عہد کا انسان اخلاقی ذمہ داریوں کو تو درکنار اپنے پیشے اور فرائض کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر رہا ہے۔ بڑے عہدیداران سے لے کر چھوٹے عہدیداران تک بیشتر مادہ پرستی اور مفاد پرستی کی جانب شدت سے مائل ہیں، یہاں تک کہ عدالتوں میں بیٹھنے والے جج جنھیں منصف کا اعلی رتبہ اور عظیم مقام حاصل ہے، وہ بھی اس مہلک مرض میں مبتلا ہیں جس کے باعث انصاف کا معیار گرتا چلا جا رہا ہے۔ آج عدالتوں میں منصف اسی شخص کے موافق اپنا فیصلہ سنا رہا ہے جس سے اس کے ذاتی مفاد وابستہ ہیں۔

عدل ہو گیا غائب اب تو ہر عدالت سے
پھر کوئی طلب کرنے منصفی کہاں جائے

مینو بخشی

مفاد پرستی نے انسان کے اندر منافقت کا رجحان پیدا کر دیا ہے۔ وہ اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے دو چہرگی کا سہارا لے رہا ہے۔ دو چہرگی رفتہ رفتہ کثرت چہرگی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ موجودہ عہد میں لوگ اسے ایک فیشن کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ ایسے میں نیک اور معتبر انسان کی شناخت کر پانا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ کسی پر اعتبار

کرنے سے قبل اسے ہر طرح سے جانچا اور پرکھا جائے۔ کیوں کہ:

آدمی کو مثل سکہ دیکھئے پہچانئے
ایک چہرہ پشت پر ہے ایک چہرہ سامنے
متین عمادی

ہر سماج کے اپنے اصول وضوابط اور اس کی اپنی قدریں ہوتی ہیں جن سے اس سماج کا تشخص قائم ہوتا ہے۔ ہر عہد میں شعرا اپنے دور کے سیاسی وسماجی نظام اور اسی کی تہذیبی قدروں کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے رہے ہیں۔ موجودہ دور کی دیہی اور شہری زندگی کی قدریں بھی نئی غزل میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ دیہی سماج اور شہری سماج کی زندگیوں میں بڑا فرق ہے۔ جن میں چند بنیادی باتیں یہ ہیں کہ دیہات میں انسان ایک دوسرے کا غمخوار، مددگار اور خوشی ورنج میں شریک ہوتا ہے جبکہ شہری زندگی میں کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ دوسروں کی خبر گیری کرے اور کسی کی غمخواری اور مدد کے لیے خود کو آمادہ کر سکے۔ دیہات کے باشندوں میں خلوص، ایمانداری، خودداری، ایثار، محبت اور انسانیت کا جذبہ ہوتا ہے جبکہ شہری زندگی گزارنے والے افراد کے دل مذکورہ جذبات سے کافی حد تک عاری ہوتے ہیں۔ عہد حاضر میں شہری کرن بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے جس سے شہر کی تہذیب دیہات اور گاؤں تک پہنچتی جا رہی ہے۔ بہار سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے ان کا ایک شعر اس کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

یہ کیسے جانتا گر شہر میں آیا نہیں ہوتا
یہاں دیوار تو ہوتی ہے مگر سایہ نہیں ہوتا
قیصر صدیقی

جب کہ مشہور شاعر منور رانا کہتے ہیں:

تمھارے شہر میں مردے کو سب کاندھا نہیں دیتے
ہمارے گاؤں میں چھپر بھی سب مل کر اٹھاتے ہیں
منور رانا

اور ظفر صدیقی کا کہتے ہیں:

سراسر قہر ہوتی جا رہی ہے
یہ بستی شہر ہوتی جا رہی ہے
ظفر صدیقی

موسم کا نظام دن بہ دن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ بارش بے وقت ہو رہی ہے یا بہت کم ہو رہی ہے، دھوپ کی تمازت میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے جس سے اکثر تالاب وندیاں سوکھتی جا رہی ہیں، قحط جیسے حالات پیدا ہو رہے ہیں، فصلوں کی پیداوار میں کمی آ رہی ہے۔ دوسری طرف درختوں کی بے پناہ کٹائی سے سیلاب آ رہے ہیں، اس سے بھی فصلیں برباد ہو رہی ہیں جو نہ صرف انسان بلکہ چرند پرند کی زندگی کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیں:

ہرا شجر نہ سہی خشک گھاس رہنے دے
زمیں کے جسم پہ کوئی لباس رہنے دے
سلطان اختر

اول تو دھوپ نے کیا برباد یہ چمن
جو دھوپ سے بچا اسے سیلاب لے گیا
ظفرانصاری ظفر

آیئے عہد حاضر کے شعرا پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

عہد حاضر کے شعرا میں علیم اللہ حالی بنیادی طور پر جدید شاعر ہیں اور انہوں نے خصوصیت سے نظم کی طرف توجہ دی ہے لیکن غزل سے بھی ان کا خاطر خواہ تعلق رہا ہے۔ اور اس دور میں بھی وہ ادبی طور پر سرگرم ہیں۔ ان کے یہ اشعار ہمیں متوجہ کرتے ہیں:

بچ بچا کر جسم سے بھاگا کوئی
گرتی دیواروں کی زد میں تھا کوئی
اب ہے حالی بے نیازی کا خلا
اب کہاں احساس بیش و کم رہا

علیم اللہ حالی کے یہاں نئے موضوعات دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر چند کہ انہوں نے اپنے آپ کو نظم نگاری کی طرف وقف کر دیا ہے لیکن ان کی غزلوں میں بھی ایک خاص جدید انداز دیکھا جا سکتا ہے۔

سلطان اختر کا مجموعہ کلام ''انتساب'' شائع ہو چکا ہے۔ یہ انتہائی معتبر شاعروں میں ایک ہیں۔ ان کا تعلق جدید اور مابعد جدید رویوں سے ہے۔ ان کی شاعری کے امکانات بھی وسیع ہیں یہ ایک طرح سے محسوسات کی شاعری کرتے ہیں جس میں ہماری زندگی کے وہ مسائل آمنے سامنے ہوتے ہیں جن سے آج ہم نبرد آزما ہیں کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں زندگی کی ایسی صداقتیں ہیں جو قدروں کی شکست و ریخت سے ٹکراتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

معراج ارتقا ہے تماشہ نہ جانئے
تہذیب عصر نو کو برہنہ نہ جانئے
منزل سے پہلے دم نہ لیا پائے شوق نے
طول طلسم راہ گزر رائیگاں ہوا

ظہیر صدیقی بنیادی طور پر ایک نظم نگار ہیں۔ ایک زمانے میں بہت فعال شاعر تھے لیکن آہستہ آہستہ رفتار وہ نہیں رہی بلکہ آج کل تو شعر و شاعری سے تقریباً تائب ہو چکے ہیں لیکن ان کے یہاں ایک اچھے شاعر کی تمکنت موجود تھی۔ انہوں نے اپنی نظموں میں جدید حسیت کو برتنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے چند اشعار دیکھیں:

نہیں کہ میں نے نہ کی مدح رہبراں لیکن
یہ کام وہ تھا کہ مجھ سے مزید ہو نہ سکا
اک ازدحام تھا بازار شاعری میں مگر
سخن ظہیر کا جنس خرید ہو نہ سکا
ایک لمحے کی خطا پھیلی تو ساری زندگی
چبھتے ذرے کانچ کے پلکوں سے چنواتی رہی

ظہیر غازی پوری کی شاعری کی طرف توجہ کیجئے تو محسوس ہوگا کہ یہ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے مختلف دبستان ادب سے اکتساب فیض کیا ہے۔ ہر چند کہ نیا ذہن رکھتے ہیں لیکن اپنا کلام مبہم نہیں بناتے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں وہ عناصر نہیں ہیں جنہیں ہم اہمال یا ابہام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی لیکن دونوں ہی میں انسانی ہمدردی کو برتنے کا ایک

عمومی مزاج رکھتے ہیں کہیں کہیں شعری اظہار میں خوش کلامی کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔اسی طرح رونق شہری، شمیم قاسمی یا شمیم فاروقی تیسرے گروہ کے بھی شاعر ہیں اور ۱۹۸۰ء کے بعد کے بھی۔

عہد حاضر کے شعرا میں خورشید اکبر ایک اہم نام ہے۔ ان کی تین کتابیں 'سمندر خلاف رہتا ہے'، ''بدن کشتی بھنور خواہش'' اور ''فلک پہلو میں'' شائع ہو چکی ہیں۔شاعری کے ان مجموعوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف جدیدیت سے کوئی رشتہ نہیں رکھتے اور جس طرح انہوں نے اپنے آہنگ کو ایک رجائی انداز بخشنے کی کوشش کی ہے وہ مابعد جدیدیت سے بہت قریب ہے۔

جدیدیت کے حوالے سے اہم سمجھے جانے والے عالم خورشید تا ہنوز غزلیں کہہ رہے ہیں۔ان کے یہاں کلاسیکی سج دھج ہے او رزبان کے رکھ رکھاؤ میں زیادہ محتاط معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بندھے بندھائے اصول کی شکست وریخت پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتے ۔ نتیجے میں ان کے یہاں جو شعری سامان ہیں وہ سب کے سب کھرے ہیں اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مزاج استادانہ ہے لیکن جب موضوعات کی طرف واپس آیئے تو اندازہ ہوگا کہ یہ اکثر و بیشتر ایسے مسائل کے بارے میں سوالات کرتے جاتے ہیں جو ان کی نگاہ میں آسان اور سہل ہیں پھر بھی جب ایسے مسائل سے ٹکرانے کا وقت آتا ہے تو وہ سب کے سب سوال بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں یہ سوال بڑے معصوم ہیں جن کا جواب بھی انہیں سوالوں میں مخفی ہے۔گویا ان کی لہک اور للک زندگی کو سہل اور آسان بنانے کے بارے میں ہے۔ایسے میں جو رکاوٹیں سامنے آتی ہیں وہ سوال بن کر ابھرتے ہیں۔

بڑھتی جاتی ہے بے چینی ناخن کی
جیسے جیسے زخم پرانا ہوتا ہے
دل روتا ہے چہرا ہنستا رہتا ہے
کیسا کیسا فرض نبھانا ہوتا ہے
آوازوں کا جنگل بھی ہے سناٹوں کا صحرا بھی
ایک طرف آبادی مجھ میں ایک طرف ویرانی ہے
عالم خورشید

قدرے مختلف انداز کے شاعر شمیم قاسمی پر ایک نگاہ ڈالیں تو انہیں نیا شاعر نہیں کہہ سکتے لیکن یہ اتنے پرانے بھی نہیں ہیں ایک سرسری نگاہ بھی ان کی شاعری پر ڈالی جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ یہ ظفر اقبال کی روش پر چلنا چاہتے ہیں۔ظفر اقبال کی روش اپنانے والوں کے معنی ہیں کہ وہ ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں اسلوب میں تہذیب کاری کا عمل جاری رہے اور آزادی کی رو میں شاعر وہ سب کچھ کرے عروض اور بلاغت کا نظام اجازت نہیں دیتا لیکن اس حد تک شمیم قاسمی نہیں جاتے ۔ یہاں رک کر میں اس بات کا اظہار کروں کہ رسالہ ''شب خون'' میں شمس الرحمن فاروقی نے ایسی تمام تر شاعری جو غایت بغاوت کا انداز رکھتی تھی خصوصاً زبان و بیان کے معاملے میں نہ صرف اپنے رسالے میں جگہ دی بلکہ فاروقی ایسی شاعری کو ایک راہ بھی دیتے رہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تجربہ نہ کیا جائے بہر حال اس کے بھی حدود ہونے چاہئیں اور ایسے حدود میں خصوصاً نئے شاعروں کو بھی زیادہ محتاط رہنا چاہئے۔

نہیں مابعد کا چکر نہیں ہے
فقط اذہان تازہ کر رہا ہے
غزل میں گھولتا ہے رس لبوں کے
ابھی تیکھی زیادہ کر رہا ہے
تھی اس کے ہاتھ میں صندل سی لکڑی
نہ جانے کیوں برادہ کر رہا ہے

عہد حاضر کے شاعروں میں جمال اویسی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ نئی نسل کی آزادی کی آواز اٹھانے والوں میں کافی سرگرم رہے ہیں۔ وہ جدیدیت سے وہ بہت دور نکل چکے ہیں۔ نئے آہنگ میں اپنے کلام کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان پر کسی قسم کا لیبل نہ لگے۔ لیکن ان کا ذہنی رویہ مابعد جدید صورت حال سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

کتنے تارے آسمان سے گم ہوئے
میں کہاں دنیا سے پوشیدہ ہوا
دئے ہیں طاق پر روشن مگر ضو میرے اندر ہے
جو کچھ کچھ تیرگی ہے وہ سماں ہے میری مٹی کا

نئے شاعروں میں عین تابش بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے ''رات کے آخر ہوتے ہوتے''، ''ہاتھے ہمارے قلم ہوئے'' اور ''اس خوشبو کا یہ قصہ ہے'' شائع ہو چکے ہیں۔ جن شاعروں کا میں نے اب تک جائزہ لیا ہے ان میں عین تابش بھی نہ صرف یہ کہ آواز میں آواز ملاتے ہیں بلکہ اپنی جگہ مخصوص کرنے کے سلسلے میں کافی سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں کچھ حصہ ایسا بھی ہے جو ان کے خاندانی پس منظر کا لازمی نتیجہ ہے۔ میری مراد تصوف اور خاندانی پس منظر کا نتیجہ ہے۔ مثلاً موت اور زندگی کے بارے میں ان کا شعر ہے:

اسی قدر ہے حیات و اجل کے بیچ کا فرق
یہ ایک دھوپ کا دریا وہ اک کنارہ شام

درج ذیل اشعار سے ان کے تیور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

ہم ایک دن قفس جاں سے باہر آئے تو
پہنچ گئے فلک نیلگوں سے آگے بھی
بکھر رہی ہیں درون وبروں کی ساری حدیں
لگائیں خیمہ درون وبروں سے آگے بھی
ہمیں خبر ہوئی یہ شہر سونے والا ہے
سو دیکھ آئے بدن کے فسوں سے آگے بھی

خالد عبادی ایک نوجوان شاعر ہیں جن کی شاعری خصوصاً مختلف معیاری ادبی رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ وہ ذاتی شناخت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ وہی شاعری قابل اعتنا ہوتی ہے جہاں اس میں روایت کا پاس تو ہو لیکن انفرادیت اور انحراف کی کچھ شکلیں نمایاں ہوتی ہوں یعنی بیک وقت وہ روایت سے آشنا بھی ہو سکتی ہے۔ نہ کسی نکتے پر انحراف کے بارے میں بھی غور و فکر کے مرحلے سے گزرے۔ خالد عبادی ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں انفرادیت بھی ہے اور روایت کا پاس بھی۔

ہوا میں آگئی ہلچل کہاں سے
یہ خود کو کون لہرانے لگا ہے
یہ بندگی بھی نہیں رد بندگی بھی نہیں
دعا کو ہاتھ اٹھائے مگر دعا نہ کرے
اب کے یہ سانحہ بھی ہونا تھا
بچ نکلنے کے بعد رونا تھا

طارق متین بھی نئے شاعروں میں ایک ہیں۔ بنیادی طور پر یہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل میں وہی سب کچھ تلاش کرتے ہیں جو

جدید تر غزل گویوں کا مزاج ہے۔ ان کے یہاں اقبال اور غالب ماڈل کی طرح ابھرتے ہیں لیکن یہ صرف اس حد تک جس حد تک ان کے اسلوب کی عقبی زمین میں کچھ کہنے کی ہمت ہو سکتی ہے۔ طارق متین اپنے انداز میں مابعد جدید شعور سے قریب ہیں۔ ان کے اشعار دیکھیں:

کوئی ہے بام پر دیکھا تو جائے
اجالے کا سفر دیکھا تو جائے
غموں کی دھوپ میں لب پر تبسم
یہ جینے کا ہنر دیکھا تو جائے
ہوائے تند برگ بے شجر کو
اڑاتی ہے کدھر دیکھا تو جائے

راشد انور راشد ایک نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ۱۹۸۰ء کے بعد انہوں نے اپنی شناخت بنانے کی کوشش کی ہے۔ جدید تر شعری رویے سے ہم رشتہ ہو کر گویا اس کے ایک رکن خاص کی حیثیت سے سامنے آ رہے ہیں۔ انہوں نے بعض مضامین ایسے لکھے ہیں جس سے ان کے ذہن و دماغ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ وہ روایت سے آشنا ہیں اور اسلوب میں زیادہ تبدیلیاں پسند نہیں کرتے لیکن مضامین کی نوعیت یقینی جدید تر ہے۔

نظر سے دور رہے مجھ کو آزمائے بھی
اگر وہ وقت نہیں ہے تو لوٹ آئے بھی
وہ موج ہے تو مجھے غرق بھی ضرور کرے
ہے ناخدا تو بھنور سے نکال لائے بھی

عطا عابدی بھی ۱۹۸۰ء کے بعد ابھرنے والے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ان کے اشعار کے مطالعے سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ ان کے یہاں بھی بعض دوسرے شاعروں کی طرح ماضی سے دلچسپی ہے۔ نتیجے میں وہ اکثر و بیشتر زمان حال اور ماضی میں جو تضاد ہے اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آج کا ماحول اور ثقافت جن برائیوں سے گزر رہا ہے اور جن میں نئی زندگی کے کتنے ہی ناسور پک رہے ہیں ان پر عطا عابدی کی نگاہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں قدروں کا احساس ہے وہ ان کی شکست و ریخت نہیں کرتے بلکہ مستحسن قدروں کو سینے سے لگانے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ بعض لوگوں نے عطا عابدی کو گاؤں کا بھی شاعر کہا ہے۔ ویسے یہ واقعتاً وہ صورت ہے جسے مابعد جدیدت کہتے ہیں۔ اور جس میں جڑوں کی تلاش کا عمل بے حد مستحسن سمجھا جاتا ہے بہر طور ان کی مختلف غزلوں سے چند اشعار نقل کرتا ہوں۔

تو جو آتی ہے تو مایوس سا ہو جاتا ہوں
اے مرے گاؤں کی خوشبو تو ادھر مت آنا
یہ عجب شہر ہے انساں نہیں سائے ہیں یہاں
لاکھ ہمدرد ہوں دلی میں مگر مت آنا
نظارے بکھرے ہیں ہر سو نظر بھی ہے لیکن
وہ شے نہیں جو نظر کو نظر بناتی ہے
یہ سچ ہے بولنا سچ مسئلوں کا حل ہے عطا
ہمیشہ بولنا سچ مسئلہ نہیں ہے کیا؟

ان کے علاوہ منظر اعجاز، منیر سیفی، امام اعظم، اظفر جمیل، انور ایرج، رسول ساقی، فردوس گیاوی، نازاں جمشید پوری، مشتاق صدف، معراج

رعنا، کوثر مظہری، شاہد اختر، منظر سلطان، سرورالہدیٰ اور ثناءاللہ ثنا دوگھروی وغیرہ اپنی غزلوں میں اپنے عہد کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

لوح محفوظ پہ لکھ اپنے کرم کی فہرست
یہ خودی تجھ کو مبارک میری تقدیر نہ لکھ
منظر اعجاز

ہونٹوں پہ تہہ بہ تہہ ہیں مسرت کی پپڑیاں
لیکن کوئی منیر کے اندر اداس ہے
منیر سیفی

ہوا ہے تیز کوئی حادثہ نہ ہوجائے
یہ رات ہو گئی پاگل کھلا نہ در رکھو
امام اعظم

اظفر جمیل تم بھی کھڑے ہو اسی طرح
دست گدائی لے کے صف انتظار میں
اظفر جمیل

جس نے موسم کے بدلنے کا بھرم پالا ہے
ان پرندوں کو یہ اشجار بدلنے ہوں گے
انور ایرج

شہادت پر مرا ایمان کامل ہے مگر مولا
مجھے تیری حفاظت کے لئے کچھ اور کرنا ہے
رسول ساقی

ہونٹوں پہ تمہارے کبھی سچ آنے نہ پائے
یہ فیصلہ بھی ہم کو عدالت سے ملا ہے
فردوس گیاوی

خود کو ہم سمجھا کئے دانائے راز
پھر بھی ہم ہر بار دھوکہ کھاگئے
مشتاق صدف

منظر بھائی شکوہ کیسا دنیا کا دستور ہے یہ
اپنے گھر کو بانٹنے والا خود بے گھر ہوجائے گا
منظر سلطان

کوئی جب پوچھتا ہے تحفۂ غم یہ دیا کس نے
مری آنکھوں میں اشکوں کا سمندر جاگ اٹھتا ہے
سرورالہدیٰ